5۔ادیب کی عزت

پریم چند (1880ء تا 1936ء)

تعارف: پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ پریم چند ۱۸۸۰ء میں ضلع بنارس کے ایک گاؤں ملہی میں پیدا ہوئے۔ پریم چند کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ وہ ڈاک خانے میں معمولی ملازم تھے۔ پریم چند ابھی بچے ہی تھے کہ ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ والد نے دوسری شادی کرلی۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ ۱۸۹۸ء میں بنارس سکول سے میٹرک کیا۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، والد بھی چل بسے، جس کی وجہ سے ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ٹیوشن پڑھا کر گزارا کرتے رہے، بعد میں پرائمری سکول میں استاد بن گئے۔ پرائیویٹ طور پر ایف۔اے اور بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ آخر کار ڈپٹی انسپکٹر اسکول کے عہدہ پر ترقی کر گئے۔ گاندھی کی تحریک ترکِ موالات کی حمایت کی۔ ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ بنارس سے رسالہ ''آج'' جاری کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا مشہور افسانہ ''کفن'' شائع ہوا۔ ویسے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہو چکا تھا۔ پہلے پہل وہ نواب رائے کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کی صدارت کی۔ ۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بنارس میں فوت ہوئے۔

تصانیف:۔ افسانوی مجموعے:۔ سوزِ وطن، خواب وخیال، پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، واردات، زادِ راہ اور آخری تحفہ، (ناول:۔ بازارِ حسن، نرملا، گئودان، میدانِ عمل، بیوہ وغیرہ) ادیب کی عزت، ان کے افسانوی مجموعہ ''آخری تحفہ'' سے ماخوذ ہے۔)

مشکل الفاظ کے معانی:

صفحہ 20 ۔آنکھ لگنا (نیند آنا، محوِ خواب ہونا) کچی نیند جگا دینا (سائنس کے اعتبار سے چھ گھنٹے کی نیند مکمل ہے اور اس سے پہلے جگا دینا، نیند پوری ہونے سے پہلے جگانا) محو (مگن، مصروف، کھو جانا) تصنیف (تحریر، کتاب) اشاعت (شائع ہونا) قعر گمنامی (گمنامی کا گڑھا، گمنامی کی گہرائی) ناموری (شہرت، مشہوری) ایجاد (اختراع، نئی چیز بنانا) امتیازی صفت (دوسروں سے جدا کرنے والی خوبی، وہ خوبی جو پہچان کا ذریعہ بن جائے) کسب معاش (کسب: کمانا، معاش: روزی، روزی کمانا) جسم گھل گیا (جسم کا لاغر ہونا جسم کمزور ہوگیا) بیماری (کسی بھی انسانی جسم کے حصے کا اپنی نارمل حالت سے منحرف ہونا، مرض) دنیا و مافیہا (و: اور ما: جو، فی: میں ھا: اس'' دنیا اور جو کچھ اس میں ہے۔ یعنی دنیا اور تمام اشیا) فکر سخن (کسی تخلیقی کام کی فکر: شعر گوئی کی فکر) انکشاف (اظہار: دریافت) بدرجہ غایت (حد درجہ: بہت زیادہ) ہمت شکن (حوصلہ توڑنے والا) عمر عزیز (پیاری عمر) تلف ہونا (ضائع ہونا، چلے جانا) تسکین (تسلی، سکون، عافیت) ناقدری (عدم احترامیت، عزت نہ کرنا، بے عزتی) کارنامہ حیات (زندگی میں کیا جانے والا عظیم کام) حقیر (معمولی) زہد (تقویٰ، پرہیزگاری) رفیقہ حیات (زندگی کی ساتھی، بیوی، جیون ساتھی) ترک (چھوڑنا خیر باد کہہ دینا) ایثار (کسی دوسرے کی خاطر اپنی کسی ضرورت سے دستبردار ہونا، قربانی) دلجوئی کرنا (دل لبھانا، دل بڑھانا، تسلی دینا) ماتھے پر بل نہ آنا (تیوری کا نہ چڑھنا، ناراضی کا اظہار نہ کرنا، مطمئن رہنا)

صفحہ 21 ۔جان دے کر کام کرنا (ایسا مشکل کام جس کے کرنے سے جسم کمزور پڑ جائے، بہت محنت سے کام کرنا) ہوا کھانا (سیر و تفریح کرنا) روٹیوں کے لالے (نیم فاقے کی حالت، روٹیوں کی فکر، مشکل ہونا) تپ (مشقت، محنت، لفظی معانی بخار) یاس (ناامیدی، مایوسی) امید کی سرخی (امید کی کرن)

صفحہ 22 ۔رئیس (سردار، رہبر) تقریب (دعوت یا شادی بیاہ کا موقع) مدعو کرنا (شرکت کی دعوت دینا، بلانا، شامل ہونے کا کہنا) خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا تھا (بہت زیادہ خوش تھا قلبی خوشی) تخیل (سوچ، خیال، تصور) خیر مقدم کرنا (استقبال کرنا، کسی

کی آمد پر عزت افزائی کرنا) سرابِ ہستی (زندگی کا دھوکہ، نظر کا دھوکہ) زورِ طبع (طبیعت کا جوش، مراد شاعری، شعر کہنے کی صلاحیت) جھاڑ پونچھ کر کے (صاف کر کے) ناحق (غلط طور پر، بلاوجہ) پھٹے حالوں (بُرے حالات) نادم (شرمندہ، پشیماں، خجل)

صفحہ 22 ۔ بیگانہ (جس سے کوئی واسطہ نہ ہو، لاتعلق، غیر) جان نظر آئی (وزن محسوس ہوا، صحیح لگی) اہلِ نظر (سوجھ بوجھ رکھنے والا اہلِ بصیرت) اعتراف کرنا (ماننا، تسلیم کرنا) پس و پیش نہ ہونا (حیلہ بہانہ نہ ہونا، ہچکچاہٹ نہ ہونا، تامل نہ ہونا) چراغ جل جانے کے بعد (تاریکی چھا جانے کے بعد، رات کا اندھیرا ہونے کے بعد) اعزاز (عزت، وقار، رتبہ، مرتبہ) ارتقا (ترقی، آگے بڑھنا) لطیف (لطف کا باعث، پاکیزہ، نفیس، ذہنی یا قلبی مسرت کا باعث) عظیم الشان طاقت (مراد اللہ تعالیٰ) حاضر و ناظر (موجود اور دیکھنے والا مراد اللہ تعالیٰ) جاہ (مرتبہ، شان) رفعت (عزت، بلندی، عظمت) میلان (رُجحان، مائل ہونا، مرعوبیت) ہوس (خواہش، لالچ آرزو، تمنا) معیوب (عیب والا، بُرا) ضعف (کمزوری، ناتوانیت) حرف گیری (اعتراض، طعنے دینا، طنز) دامن گیر ہونا (دامن پکڑنا، رکاوٹ ہونا، روڑے اٹکانا) گلا چھڑانا (گلوخلاصی، جان چھڑانا، بے دخل ہونا) سبیل (راستہ، حل، طریقہ) فاقہ کشی (بھوکا رہنا) نوبت (حالت، انتہائی کیفیت) میٹھی نیند (آرام کی نیند) امکان میں (بس میں) شناسا (جاننے والا، واقف کار) شرمندہ احسان ہونا (احسان مند ہونا، شکرگزار ہونا) بدنیت (نیت کا فتور، خراب ارادے والا) معاً (اچانک، فوراً)

صفحہ 23 ۔ عقل کا فتور (عقل کا بگاڑ، ذہن کی خرابی) بے تکی (بے ڈھنگی، بے ترتیبی، ناموزوں، بھدی) گنوار (جاہل، اُجڈ، ان پڑھ) اُچکا (چور، اٹھائی گیرا، اُچک لینے والا، کوئی چیز اٹھانے والا) ڈیل ڈول (قد و قامت، جسم کی ساخت و صحت) چہرہ مہرہ (شکل وصورت) فربہی (موٹاپا) خدا واسطے کا بیر ہونا (بلاوجہ کی مخالفت ہونا) سوز (دُکھ، درد، جلن) لوچ (نرمی، نزاکت) آنکھ بچا کر (بچتے ہوئے، گریز کرتے ہوئے) تقاضا (طلب، مانگنا) دندان شکن جواب دینا (منہ توڑ جواب دینا، سخت جواب دینا) عزت اتارنا (بے عزتی کرنا) جی نہ بھرا (دل سیر نہ ہُوا) بساطی (خوردہ فروش، چھوٹی چھوٹی گھریلو چیزیں بیچنے والا) چھاتا (چھتری) دیوالیہ نکلنا (مفلس ہونا، کچھ نہ بچنا، کنگال ہونا، تہی دست ہونا) باچھیں کھلنا (بے حد خوش ہونا، بہت زیادہ خوش ہونا) قدر شناس (رُتبے کو جاننے والا، قدر پہچاننے والا یعنی عزت کرنے والا) وبال (مصیبت، دُکھ) مرعوب ہونا (متاثر ہونا، رُعب میں آنا) عجز (انکسار، تواضع، عاجزی)

صفحہ 24 ۔ نام کو رو بیٹھا تھا (ناامید ہو جانا، صبر کر بیٹھا تھا، بھول بیٹھا تھا) درشن دینا (دکھائی دینا، ملاقات ہونا) تقاضا (طلب، مانگنا) آہنی خود (لوہے کی ٹوپی، جو جنگوں میں استعمال ہوتی تھی) کارگر ہونا (اثر کرنا، موثر ہونا) اشتیاق (شوق، انتہائی خوشی) ریاست (حکومت، سرداری، چھوٹے خطے پر حکومت) دربان (سنتری، پہرے دار، چوکیدار، محافظ) جھجکنا (ہچکچاہٹ محسوس کرنا) اصحاب (صاحب کی جمع، دوست، رفقاء، احباب) داد (تعریف، شاباش) مستثنیٰ (ماسوا، الگ، بری الذمہ ہونا) بارہ دری (ہوادار کمرہ، کھلا کمرہ) آراستہ (سجا ہوا) قوسِ قزح (دھنک، سات رنگوں کا دائرہ) رتن (ہیرے، قیمتی پتھر، جوہر) شیرینی (مٹھاس) جدت (نئی چیز، نیا پن) تخیل (سوچ، فکر، خیال، تصور) روانی (بہاؤ، بے ساختہ کہنا) ندرت (انوکھا پن، نیا پن) بے اعتنائی (غفلت، بیگانگی، لاپروائی، بے نیازی، عدم توجہی) جو بھر کم نہ سمجھنا (بالکل برابر سمجھنا، ذرہ برابر بھی کم نہ سمجھنا) روحانیت (رُوح کی خاصیت یہاں مُراد ہے دل میں جنم لینے والے لطیف جذبات و احساسات) فقدان (کمی) ہجر و وصال (محبوب سے بچھڑنا اور ملنا) منتہائے مقصود (اصل مقصد، منزل، نصب العین) اینٹ کا جواب پتھر سے دینا (سخت تر جواب دینا، منہ بند کرنا، خاموش کرنا) بہکنا (خاموش کرنا، مدہوش لوگوں کی طرح ادھر اُدھر کی باتیں کرنا) تپاک سے (گرم جوشی سے، والہانہ انداز سے)

صفحہ 25۔ باطنی مفہوم (داخلی مفہوم، پوشیدہ مفہوم، چھپا ہوا مطلب) خیالی پلاؤ پکانا (ایسی باتیں سوچنا جن کا کوئی وجود نہ ہو) جھنجھلانا (غصہ ہونا، ناراض ہونا) پھولے نہ سمانا (بہت خوش ہونا) طعن (ملامت، بُرا بھلا کہنا) ہوس مند (لالچی، خواہش مند) مؤکل (وہ شخص جو کسی کو اپنا وکیل مقرر کرے) مصرف (استعمال، مطلب، کام، غرض) ہل چل (کھلبلی ہونا، تہلکہ بپا ہونا) غضب ہی کر ڈالا (ظلم کیا، ناموزوں کام کیا) بھاٹ (نسب نامہ سنانے والا) میراثی (گانے بجانے والا) چہرہ کھلا ہوا تھا (خوش نظر آ رہے تھے)

سبق کا خلاصہ

(ملتان، ڈیرہ غازی خان 06,07,08,09، سرگودھا 10,13، لاہور، گوجرانوالہ، فیصل آباد 06,07,08,09,12,13، ملتان بورڈ 10، فنی بورڈ لاہور 13ء)

قمر صاحب ہر وقت ادب تخلیق کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی وفادار بیوی اُن کی خدمت واطاعت کے لیے تیار رہتی ہے۔ ایک صبح قمر صاحب نے بیسیوں دفعہ ابلی ہوئی چائے بغیر چینی اور دودھ کے لی اور ناشتہ کیا۔ اس کے بعد وہ کتاب لکھنے میں مگن ہو گئے، جو اُن کے خیال کے مطابق حالیہ صدی کی بہترین تصنیف اور اسے شہرت کے آسمان تک پہنچانے کا ذریعہ ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ کسی اور ذریعۂ روزگار کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ چالیس برس کی عمر میں فاقوں اور افلاس کی وجہ سے بڑھاپے نے آلیا تھا۔ اُن کی بیوی سکینہ ہر وقت اُن کی دل جوئی کرتی رہتی۔ اُس کے سیر کے مشورے پر قمر صاحب بولے کہ سیر اُن لوگوں کا حق ہے، جنھیں مالی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ مجھ جیسے ادیب و مزدور کا سیر سے کیا واسطہ۔ مایوسی کی باتیں سُن کر اُن کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ مگر دل میں اُمید تھی کہ قمر صاحب کو ایک روز ضرور صلہ ملے گا اور اُن کی امیدیں بار آور ہوں گی۔

ایک رئیس نے حضرت قمر کو بھی تقریب میں مدعو کیا۔ آج وہ بہت خوش تھے اور سارا دن اپنی عزت افزائی کے خیالات میں مگن رہے۔ انھوں نے ایک نظم بھی تیار کی اور خوب بن سنور کر اچکن زیب تن کرنے لگے تو بیگم نے کہا کہ اس طرح کے لباس میں رئیس کے ہاں جانا موزوں نہیں۔ لیکن قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے جواب دیا کہ میں کوئی زمیندار یا جاگیردار نہیں ہوں، صرف شاعر ہوں اور اسی وجہ سے میری عزت ہے۔ بیوی نے تقریب میں جانے سے منع کیا لیکن قمر صاحب نے کہا کہ عزت کی تمنا، ارتقائے روحانی کے لیے لازمی ہے۔ بیوی نے کہا کہ میرے پاس ایک آنہ رہ گیا ہے کل کے لیے کوئی سبیل سوچو۔ قمر نے کہا کہ اخبارات سے روپیہ آ گیا تو ٹھیک ورنہ فاقوں کی نوبت۔

شام کو قمر صاحب پھٹی پرانی اچکن، سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہن کر رئیس صاحب کی دعوت میں شرکت کے لیے نکل پڑے۔ پہلے تو وہ دکان داروں کے سامنے جانا گوارا نہ کرتے تھے۔ لیکن آج بڑے دبدبے سے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں حافظ صمد بساطی کی دُکان پر رُکے، جنھوں نے قرض کا مطالبہ کیا۔ قمر صاحب نے انھیں راجہ صاحب کے ہاں جانے کا بتا کر مرعوب کر دیا۔ حافظ صمد نے پان کی پیش کش کرتے ہوئے رخصت کیا اور کہا کہ ایسے لوگوں کی قدر دانی راجہ صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ پھر ایک کپڑے والے کی دکان پر رکے، جس نے منشی سے حساب طلب کیا تو قمر صاحب نے فوراً راجہ صاحب کا ذکر کر کے اسے مرعوب کر دیا۔

آخر کار قمر صاحب جوں ہی راجہ صاحب کے بنگلے پر پہنچے تو دربان نے کارڈ طلب کیا، جس پر قمر صاحب نہایت برہم ہوئے۔ واپس جانے کو تھے کہ دربان نے اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر واپس طلب کر لیا۔ راجہ صاحب نے قمر صاحب کا استقبال کیا اور انگریزی لباس میں ملبوس دوستوں سے متعارف کرایا۔ ان انگریز نماؤں نے بدیسی

شعراء، بائرن، شیلے، ٹینی سن کی تعریف کی اور دیسی شعراء کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ اس پر قمر صاحب نے جلال میں آ کر منہ توڑ جوابات دیے، جسے رلجہ صاحب نے ناپسند کیا اور انھیں خاموش کرا دیا۔ اتنے میں مہمان خصوصی آئے اور قمر صاحب سے ان کی شان میں نظم کے متعلق سوال کیا، قمر صاحب نے کہا کہ انھوں نے کوئی نظم نہیں لکھی۔ کسی اور کی نظم سنانے کے متعلق انھوں نے کہا کہ وہ بھاٹ یا میراثی نہیں ہیں۔ بیوی نے جلدی واپس آنے کی وجہ دریافت کی تو قمر صاحب نے کہا "آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے ہوں۔ میں نے اس بات کو فراموش کر دیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ گمراہ نہ ہونے دیا" مرا یہ جھونپڑا ہی میری جنت ہے میں نے آج سمجھ لیا ہے کہ ادبی خدمت عین عبادت ہے۔

مشقی سوالات

سوال 1 درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔

(i) حضرت قمر نے چائے کا پیالا تیار کیا:

✓ (الف) بیس دفعہ اُبالی ہوئی (ب) تیس دفعہ اُبالی ہوئی

(ج) چالیس دفعہ اُبالی ہوئی (د) پچاس دفعہ اُبالی ہوئی

(ii) حضرت قمر کی رائے میں چائے میں دودھ ملانا:

✓ (الف) ہمارے رئیسوں کی ایجاد ہے (ب) ہمارے غریبوں کی ایجاد ہے

(ج) ہمارے حکمرانوں کی ایجاد ہے (د) ہمارے عوام کی ایجاد ہے

(iii) حضرت قمر کی بیوی کا نام تھا:

(الف) رضیہ (ب) رفیعہ

(ج) نصیبہ ✓ (د) سکینہ

(iv) قمر صاحب کے پاس رُوپے کہاں سے آنے والے تھے:

✓ (الف) اخباروں سے (ب) دکان داروں سے

(ج) رئیسوں سے (د) شاعروں سے

سوال 2۔ مختصر جواب لکھیں۔

(i) قمر صاحب نے اپنے ہنسنے کے بارے میں کیا کہا؟

جواب قمر صاحب نے کہا وہ لکھنے میں اتنا مگن رہتے ہیں کہ مہینوں تک ہنسنے کی نوبت نہیں آتی۔

(ii) قمر صاحب رئیس کے ہاں کیسے کپڑے پہن کر گئے؟

جواب قمر صاحب رئیس کے ہاں پھٹی پرانی اچکن، سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہن کر گئے۔

(iii) قمر صاحب رئیس کے ہاں جاتے وقت کن لوگوں سے ملے؟

جواب قمر صاحب رئیس کے ہاں جاتے وقت حافظ بساطی اور کپڑے والے سے ملے۔

(iv) قمر صاحب نے کارڈ مانگنے پر کیا کہا؟

جواب قمر صاحب نے کارڈ مانگنے پر کہا "میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں"، اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں آپ راجا صاحب سے کہہ دیجئے گا، قمر آیا تھا، لوٹ گیا"۔

(v) قمر صاحب نے انگریزی ادب کے بارے میں کیا کہا؟

جواب قمر صاحب نے انگریزی ادب کے بارے میں کہا کہ ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔

(vi) قمر صاحب نے لکھنے پڑھنے کے کام کو عبادت کیوں کہا؟

جواب قمر صاحب نے لکھنے پڑھنے کے کام کو عبادت اس لیے کہا ہے کہ عبادت اور ادب دونوں میں صلہ کی توقع کے بغیر ہی کام کیا جاتا ہے۔

(vii) افسانہ نگار نے اس افسانے کا نام ادیب کی عزت کیوں رکھا؟

جواب افسانہ نگار معاشرے میں ادیب کے موجودہ مقام سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے خیال میں ادیب معاشرے کا قابل عزت اور قابل احترام فرد ہے۔ اسے اس کا جائز مقام اور عزت ملنی چاہیے۔

اہم عبارات کی تشریح

عبارت نمبر 1:

(لاہور بورڈ 2012ء)

جوانی ہی میں انھیں یہ بیماری لگ گئی تھی اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے۔ انھوں نے کسب معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیر لیا مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ طلوع آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا۔ اب انھیں یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمر عزیز یوں تلف ہو گئی یہ تسکین بھی نہیں کہ دنیا نے ناقدری کی ہو مگر ان کا کارنامہ حیات حقیر نہیں۔ ضروریات زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں۔ اگر کوئی تسکین تھی تو محض یہ کہ ان کی رفیقہ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی۔ قمر کو دنیا سے شکایت ہو مگر سکینہ ہمیشہ اس کی دل جوئی کرتی رہتی تھی اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی اس نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔

نوٹ: (جو طلبا ہر عبارت کا الگ سے سیاق وسباق نہیں لکھ سکتے، وہ سبق ہذا میں سے دی گئی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل یہ سیاق وسباق تحریر کر سکتے ہیں)

تشریح طلب اقتباس اُردو کی درسی کتاب کے سبق سے لیا گیا ہے، جو مصنف کی مشہور زمانہ کتاب ''آخری تحفہ'' سے منتخب کیا گیا ہے۔ سبق میں مصنف ایک ایسے ادیب کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ جو زمانے کے حالات سے ستایا ہوا ہے اور غربت کے ہاتھوں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ وہ دن رات کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے آپ کو بلندیوں پر جاتا ہوا دیکھتا ہے۔ ایک دفعہ ایک رئیس نے اسے اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ وہاں اُس کی خوب ''عزت افزائی'' کی گئی۔ وہ محفل کا آغاز ہوتے ہی وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ یہ کہتا ہوا اپنے گھر لوٹ آیا کہ ''میں تو چراغ ہوں اور جلنے کے لیے ہوں''

تشریح طلب اقتباس سبق کے .... سے لیا گیا ہے۔ (آغاز۔ درمیان۔ اختتام)

سیاق وسباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ صبح کے وقت قمر صاحب نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے پی کر قلم دوات سنبھالی۔ بیوی نے اٹھ کر پوچھا چائے پی چکے۔ انھوں نے جواب دیا ہاں پی چکا۔ لکھنے لکھانے کا مرض انھیں جوانی سے تھا اور بیس سال سے اس مرض میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ان کا جسم گھل گیا اور چالیس سال کی عمر میں بڑھاپے نے آ گھیرا۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ قمر کی بیوی انھیں سیر کا کہتی ہے، جس پر وہ راضی نہیں

ہوتے۔ رئیس کے ہاں سے دعوت نامہ ملا جسے پا کر وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے سرِ شام ہی تیاری کر لی اور پھٹی ہوئی اچکن پُرانے جوتے اور بے تکی ٹوپی سر پر رکھ کر دعوت میں چلے گئے۔ جہاں ان کی کسی انگریزی پوش سے جھڑپ ہوگئی جس کے نتیجے میں وہ بغیر کچھ سنائے اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر گھر چلے آئے۔ آج وہ بڑے خوش تھے کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ چراغ ہیں اور جلنے کے لیے ہیں۔

تشریح:

زیرِ تشریح عبارت میں مصنف نے حضرت قمر کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ جوانی کی عمر جو کہ جوش و جذبات کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو شعر و شاعری اور لکھنے لکھانے کے کام کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ اپنی تمام تر توجہ اور دھیان، ادب تخلیق کرنے میں لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے دنیا کے باقی معمولات کو ثانوی حیثیت دے رکھی تھی۔ جب کہ شعر و شاعری کو اولیت دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے مصنف نے حضرت قمر کے شعر و شاعری کے والہانہ شوق اور جذبے کو بیماری قرار دیا ہے۔ جب انسان کو کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور اس کا علاج بھی نہ کرایا جائے تو بیماری میں کمی نہیں آتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح قمر صاحب کے لکھنے لکھانے کے شوق میں کمی نہیں آرہی تھی بلکہ اضافہ ہو رہا تھا اور بیس سال سے اس بیماری یعنی شعر و شاعری کے فن کی آبیاری کر رہے تھے۔

شاعر عموماً حساس اور نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ان کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ فن پارے تو تخلیق کر سکتے ہیں لیکن اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے دنیاوی معاملات میں خاصی بے نیازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور محنت مشقت اور روزی کمانے کے دوسرے ذرائع کی طرف دھیان دینا اُن کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چناں چہ قمر صاحب میں بھی کافی بے پروائی اور بے نیازی تھی۔ جس کی وجہ سے اُنھوں نے کسی اور ذریعہ معاش کی طرف دھیان نہ دیا۔ انھوں نے اپنی تمام تر توجہ کتاب لکھنے میں مرکوز کر دی۔ جس کی وجہ سے اُس کے مسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مفلسی اور غربت نے اُس کے گھر میں ڈیرے ڈال لیے۔ بقول آسکر وائلڈ:

"اکثر شاعر غریب ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر غریب لوگ ہی شاعر بنتے ہیں"

قمر صاحب دنیا کے تمام جھمیلوں سے الگ تھلگ کتاب لکھنے میں مصروف و مگن رہتے۔ اُن کا خیال تھا ان کی یہ تصنیف انھیں گمنامی کے گڑھے سے نکال کر شہرت کے آسمان پر پہنچا دے گی اور اس کے تمام معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔

اسی لیے حضرت قمر نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور توانائیوں کو شعر و شاعری میں صرف کر دیا۔ اور اپنی صحت کی طرف متوجہ نہ ہوئے، جس کی وجہ سے وہ جسمانی لحاظ سے بہت کمزور ہو گئے۔ صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور چالیس سال کی عمر میں بڑھاپا غالب آ گیا اور بڑھاپے کو مصنف نے لاعلاج مرض قرار دیا ہے۔ لارڈ جیمس نے بجا کہا ہے کہ:

"ہر خرابی کا تدارک ہو سکتا ہے، لیکن بڑھاپے کا کوئی تدارک نہیں"

حضرت قمر کا معمول تھا کہ جوں ہی صبح سورج طلوع ہوتا تو وہ لکھنا شروع کرتے اور رات گئے تک دنیا اور دنیا کے معاملات سے کنارا کش ہو کر شعر و شاعری میں مگن رہتے۔ مصنف نے قمر کی ادب سے وابستگی اور حد سے زیادہ شوق کی وجہ سے اُسے ادب کا پجاری قرار دیا ہے۔ کیوں کہ انسان جس کی پوجا کرتا ہے اُسے اپنی ذات سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ادب تخلیق کرنے کے لیے اتنی زیادہ محنت و مشقت اور اپنے آرام و سکون اور صحت کی قربانی دینے کے باوجود جب لوگوں نے پزیرائی نہیں دی تو حضرت قمر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔ انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ شاید ان کے مضامین معنوی خوبیوں سے عاری ہیں اور اس بات کا ادراک ان کے لیے حد سے زیادہ حوصلہ شکن تھا۔ اور وہ مایوسی کا شکار ہوئے۔ انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ انھوں نے اپنی جوانی کے قیمتی ایام یوں ہی ضائع کر دیے۔ اگر دنیا قدر دانی کرتی تو ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا مگر قمر صاحب کا ضمیر مطمئن تھا کہ وہ جو زندگی کا عظیم

کارنامہ انجام دے رہے ہیں کوئی معمولی اور حقیر کارنامہ نہیں ہے۔

اسی امید پر انھوں نے اپنی زندگی کی ضروریات کو تنگی اور پرہیز گاروں کی طرح بہت کم کر دیا تھا۔ جس طرح متقی اور پرہیزگار لوگ اللہ سے لو لگانے کے لیے دنیاوی خواہشات کو پامال کر دیتے ہیں اسی طرح کا رویہ قمر صاحب نے اپنا رکھا تھا۔ دنیا کی ناقدری کا شکار قمر کے لیے واحد تسلی اور اطمینان کا ذریعہ اس کی رفیقہ حیات سکینہ تھی۔ جو دنیاوی خواہشات کو قربان کرنے میں قمر سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ ان بُرے حالات میں بھی شکوہ شکایت کرنے کی بجائے مطمئن اور شاکر تھی۔ قمر صاحب کو دنیا سے شکوہ ہوگا لیکن سکینہ ہمیشہ قمر صاحب کا دل بڑھاتی رہتی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

"دنیا دولت ہے اور اچھی دولت نیک عورت ہے"

مصنف مزید لکھتے ہیں کہ سکینہ بڑی صبر کرنے والی اور قناعت پسند تھی۔ اپنے نصیبوں کو کوسنے اور ملامت کرنے کی بجائے اُس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بھی کبھی ناراضی اور اُداسی کا اظہار نہیں کیا۔

عبارت نمبر 2:

(گوجرانوالہ بورڈ 2007، بہاول پور بورڈ 08-2007)

یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

"مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی عوام میں عزت ہے میں تو مل کا مزدور ہوں۔ تم نے بھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنھیں کھانے کی کمی نہیں ان کو ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر بھی ان ہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پر کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے"

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سنیں تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا اس تپ کا پھل ایک دن انھیں ضرور ملے گا، دولت حاصل ہو نہ ہو لیکن قمر صاحب یاس کی حد تک جا پہنچے تھے، جہاں سے سمتِ مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

سیاق وسباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ صبح کے وقت حضرت قمر نے چائے پی اور لکھنے بیٹھ گئے۔ لکھنے کا یہ مرض انھیں جوانی سے تھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے کسب معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ دی اور چالیس سال کی عمر میں ہی بڑھاپے نے انھیں آگھیرا۔ ان کی بیوی سکینہ ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتی رہتی اور انھیں سیر کرنے کے لیے کہتی رہتی تھی۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ سکینہ کو اس بات کا بھروسا تھا کہ قمر کو ان کی محنت کا پھل ضرور ملے گا۔ ایک رئیس کے ہاں سے دعوت نامہ موصول ہوا جسے پا کر قمر بہت خوش ہوئے۔ سکینہ نے انھیں جانے سے منع کیا مگر وہ بضد تھے۔ سرِ شام ہی قمر صاحب پھٹی پرانی اچکن پہنے سر پر بے تکی سی ٹوپی رکھے بازار میں نکل گئے۔ دو ایک دکان داروں کے ہاں سے ہو کر وہ رئیس صاحب کے ہاں گئے جہاں ان کی تکرار ایک انگریزی پوش سے ہو جاتی ہے۔ حضرت قمر اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر بغیر کچھ سنائے واپس لوٹ آتے ہیں۔ مگر مطمئن ہیں کہ انھوں نے جان لیا کہ ان کا گھر ہی ان کے لیے جنت ہے۔

تشریح:

زیر تشریح عبارت میں مصنف لکھتے ہیں کہ جب سکینہ نے حضرت قمر کو مایوسی اور اداسی کے عالم میں دیکھا تو اس نے کہا کہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے۔ جب معلوم ہوگیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی صلہ نہیں ملتا تو بے کار کیوں اتنی سخت محنت کر

رہے ہو۔ تو قمر نے کہا لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں۔ سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ سکینہ نے قمر صاحب کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ اتنے پڑھے لکھے لوگ روزانہ سیر و تفریح کرنے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ قمر صاحب منطقی انداز میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیر و تفریح کرنے والوں میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کو سیر کرنے کی وجہ سے کوئی مالی نقصان نہیں ہوتا۔ ان میں سے اکثریت تو سرکاری ملازموں کی ہوتی ہے، جنھیں ہر ماہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ سرکاری ملازمت میں دیگر مراعات کے ساتھ ساتھ چھٹیوں کی سہولت بھی میسر ہوتی ہے۔ تعطیلات کا ان کی تنخواہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کی مقررہ تنخواہ بلا تعطل انھیں ہر ماہ کے آخر میں مل جاتی ہے۔

اسی طرح جن کی عوام میں عزت، دتی ہے یعنی امرا کا طبقہ ان کو بھی سیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ہمارا معاشرہ تصنع کا دلدادہ ہے، اس لیے مصنوعی معاشرہ میں عزت کا معیار، محبت و مروت، شرافت و نجابت کی بجائے بنگلے گاڑیاں اور دولت ہوتی ہے قمر صاحب کے خیال میں امرا کا طبقہ بھی اگر سیر و تفریح کرتا ہے، تو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قمر صاحب نے اپنے آپ کو مل کا مزدور قرار دیا ہے کیوں کہ مزدور کو مزدوری اس کے کام کرنے کی وجہ سے ملتی ہے۔ اگر مزدور کام نہیں کرتا تو اسے مزدوری سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے معمولات میں فرق آتا ہے اور مسائل میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بقول اقبالؒ:

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

قمر صاحب اپنی بیوی سے استفہامیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ تم نے کبھی مزدوروں کو بھی سیر و تفریح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دراصل جنھیں کھانے کی کمی نہیں ہوتی وہ سیر و تفریح کرتے ہیں۔ جنھیں پیٹ بھر کر کھانے کو میسر ہو انھیں سیر کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ جنھیں روٹیوں کی فکر لاحق ہو اور دو وقت کا کھانا بھی ڈھنگ سے میسر نہ ہو، تو وہ سیر پر نہیں جاتے۔ پیٹ بھر کر اور رنگا رنگ کھانے والے لوگ ہی سیر کرنے کے لیے جاتے ہیں تاکہ وہ بیماریوں سے بچے رہیں، صحت مند رہیں اور ان کی عمر بھی لمبی ہو۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بے پناہ دولت اور دیگر سہولیات سے مستفید ہوں۔ کیوں کہ ان کی زندگی ان کے لیے وبال نہیں بلکہ نعمت ہوتی ہے۔ جن کی زندگی اُن کے لیے وبال بن چکی ہو غربت اور مسائل نے نڈھال کر دیا ہو، وہ تو زندگی کے بوجھ سے تنگ آ کر موت کو عافیت سمجھتے ہیں۔ قمر صاحب سکینہ سے کہتے ہیں کہ میری زندگی بھی میرے لیے بوجھ بنی ہوئی ہے چناں چہ اس بوجھ کو مزید اٹھانے کی مجھ میں سکت اور خواہش نہیں ہے۔

عبارت نمبر 3:

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے۔ آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ناچ رہا ہے۔ سارا دن وہ اسی تخیل میں محو رہے۔ راجا صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انھی خیالات کے لطف اٹھاتے رہے اس موقع کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی تیار کی جس میں انھوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی۔ سراب ہستی ان کے زورِ طبع کے لیے زیادہ موزوں چیز تھی مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

سیاق و سباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ صبح کے وقت حضرت قمر چائے پی کر لکھنے بیٹھ گئے۔ لکھنے کا مرض انھیں جوانی سے تھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے کسب معاش کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے انھیں آگھیرا۔ ان کی بیوی سکینہ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتی ہے اور اب انھیں سیر کی تجویز دیتی ہے جب کہ قمر کا خیال ہے کہ سیر کرنا وقت کا ضیاع ہے، صرف وہ لوگ سیر کرتے ہیں جنھیں مہینے کے آخر میں تنخواہ مل جاتی ہے۔ مجھ جیسے مل مزدور سیر کرنے نہیں جاتے۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ قمر نے رئیس کے ہاں جانے کے لیے دوپہر سے ہی تیاریاں شروع کیں۔ سکینہ نے انھیں وہاں جانے سے منع کیا مگر وہ بضد ہیں۔ سر شام ہی اپنی پھٹی پرانی اچکن، بے تکی ٹوپی سر پر کے رئیس کے ہاں پہنچنے سے پہلے وہ بازار گئے اور دو ایک دکان داروں کی دکان پر بھی ٹھہرے اور دعوت کے متعلق بتایا، جس سے سب مرعوب ہو گئے۔ رئیس کے ہاں ان کی تکرار شاعری کے موضوع پر ایک انگریزی پوش سے ہوئی۔ جس کا جواب قمر نے خوب دیا اور بغیر کچھ سنائے گھر آ گئے۔ مگر جان گئے کہ ان کا جھونپڑا ہی ان کے لیے جنت ہے۔

تشریح:

زیر تشریح عبارت میں مصنف بتاتے ہیں شہر کے رئیس کے ہاں تقریب ہے۔ اس نے حضرت قمر کو بھی تقریب میں شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیجا ہے۔ رئیس صاحب کا دعوت نامہ ملتے ہی حضرت قمر کا دل باغ باغ ہو گیا۔ جس طرح صحرا میں شدید گرمی کے موسم میں مخلوق خدا تڑپ رہی ہو، ایسے میں انھیں اچانک آسمان پر بارش کے بادل دکھائی دیں، تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ ایسے ہی قمر صاحب کی روکھی پھیکی، بے کیف اور بے رونق زندگی میں رئیس صاحب کا دعوت نامہ بادل ثابت ہوا جس نے اسے اپنے سحر میں لے لیا۔ وہ سارا دن خوشیوں میں مگن و مست رہے۔ یہ خوشی انھیں خلاف توقع ملی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ شہر کا رئیس بھی اس کی عزت افزائی اور قدر دانی کرتے ہوئے محفل میں مدعو کرے گا۔ بقول ڈاسن:

"تمھارا چال چلن اس بات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم کس چیز کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو"

سارا دن وہ تصورات اور خیالات کی دنیا مگن رہے کہ جب وہ رئیس صاحب کی محفل میں جائیں گے تو وہ کس انداز اور کن الفاظ میں اس کا استقبال کریں گے۔ اور وہ خود ان کے استقبالیہ کلمات کا جواب کن الفاظ میں دیں گے۔ کیوں کہ رئیس صاحب شہر کی غیر معمولی شخصیت تھے۔ اس لیے قمر صاحب ان کی شان و شوکت کے مطابق ذہنی طور پر تیاری کرتے رہے کہ محفل میں کن کن متوقع موضوعات پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ رئیس صاحب کی تقریب تھی، اس لیے ان کی محفل میں بھی بڑے عہدوں کے مالک اور امرا کو دعوت دی گئی تھی۔ لیکن قمر صاحب کو اس لیے بلایا گیا تھا کہ ایک بڑے آدمی کی شان میں قصیدہ سنائیں گے اور محفل کا لطف دوبالا کریں گے۔ اس لیے قمر صاحب بھی اس خیال سے کہ محفل میں بڑے منصب دار آئے ہوئے ہوں گے تو ان سے تعارف ہو گا۔ سارا دن انھیں خیالات سے محظوظ ہوتے رہے۔ بقول شاعر:

پھول خوش بو کے نشے میں بکھر جاتے ہیں
لوگ پہچان بناتے ہوئے مر جاتے ہیں

مصنف مزید لکھتے ہیں کہ قمر صاحب نے موقع کی نسبت سے ایک نظم بھی لکھی، جس میں انھوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی۔ کیوں کہ امیروں، سرمایہ داروں اور اعلیٰ عہدوں کے مالک لوگوں کی زندگی میں خوشیاں، سہولیات اور وسائل زیادہ اور مسائل نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے ان کی زندگی کو باغ سے تشبیہ دی۔ کیوں کہ باغ خوشی اور خوشحالی کی علامت ہوتا ہے، جب کہ سراب ہستی یعنی زندگی ایک دھوکا ہے، ان کے زور طبع اور حالات کے لیے زیادہ مناسب و موزوں چیز تھی۔ کیوں کہ بے پناہ مشقت و ریاضت کے باوجود ان کی زندگی مسلسل دھوکہ دے رہی تھی۔ اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نظم میں اپنے اور اپنے جیسے حالات کے ستائے ہوئے لوگوں کے مسائل کا تذکرہ کرتے جن کے لیے زندگی وبال تھی اور غافل امرا کے سامنے زندگی کا تاریک پہلو پیش کر کے سراپا احتجاج بنتے۔ لیکن بے حس اور انسانی ہمدردی سے عاری لوگوں کے سامنے ایسے احتجاج کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پھر بھی قمر نے امیروں کے جذبات و احساسات کا خیال کرتے ہوئے ان کے مزاج کے خلاف نظم تیار نہ کر کے خلاف طبیعت کام کیا۔ بقول امام غزالی:

"انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل اور زبان کو قابو میں رکھے"

عبارت نمبر 4: (فیصل آباد 2012ء)

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا "جنھیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے۔ ان کے منہ دیکھتے ہیں آخر کچھ بات تو ہے کہ راجا صاحب نے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدے دار نہیں۔ زمیندار نہیں، جاگیردار نہیں۔ ٹھیکہ دار نہیں، معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے مجھے کسی کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔"

سیاق و سباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف نے بتایا ہے کہ صبح کے وقت قمر نے چائے پی اور لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ انھیں یہ مرض جوانی سے تھا۔ جس کی وجہ سے چالیس سال کی عمر میں بڑھاپے نے انھیں آ گھیرا۔ ان کی بیوی سکینہ ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتی اور انھیں سیر کی ترغیب دیتی ہے۔ جس پر قمر کا خیال ہے کہ سیر صرف وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں ہر مہینے تنخواہ مل جاتی ہے۔ ہم جیسے مل مزدور سیر نہیں کرتے۔ انھیں ایک رئیس کے ہاں سے دعوت نامہ ملا ہے پا کر وہ بہت خوش ہوئے۔ سکینہ انھیں پھٹے حالوں جانے سے روکتی ہے۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ قمر اپنی بیوی سے کہتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں عزت و احترام کی بھوک ہوتی ہے اور یہ بھوک غلط بھی نہیں۔ اپنی پھٹی پرانی اچکن میں وہ بازار کے دو چار چکر لگاتے ہیں اور ایک دو دکان داروں سے دعوت کا ذکر کرتے ہیں۔ جس سے وہ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ رئیس کے ہاں جا کر ان کی تکرار ایک انگریزی پوش سے ہو جاتی ہے۔ جس پر قمر کچھ بھی سنائے بغیر گھر واپس آ جاتے ہیں۔ مگر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے لیے جنت صرف ان کا اپنا گھر ہے۔

تشریح:

زیر تشریح عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ قمر صاحب رئیس کی دعوت میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ قمر صاحب کا ظاہری حلیہ، لباس اور اچکن دیکھ کر اس کی عقل مند بیوی نے قدرے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ تم نے بلاوجہ وہاں جانا منظور کیا۔ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر دیتے۔ ان برے حالات میں جانا تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ سکینہ کی باتیں سن کر قمر نے فلاسفروں کی طرح سنجیدہ ہو کر کہا کہ وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے دردمند دل اور سمجھ داری عطا کی ہے اور جو تعلیم یافتہ، عقل مند، اہل بصیرت اور دوراندیش ہیں، وہ دوسروں کی عزت، قدر دانی لباس کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ ان کی خوبیوں، کمالات اور اوصاف پر نظر کرتے ہیں اور اوصاف و کمالات کے مطابق مقام اور اہمیت دیتے ہیں جب کہ لباس ان کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ صاحب ادراک لوگ دوسروں کی شخصیت کی قدر و منزلت کا تعین ان کے سیرت و کردار سے کرتے ہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ:

"محض لباس سے مردم شناسی نہیں ہو سکتی کیوں کہ آدمی کو بنانے والا خدا ہے اور لباس کا درزی"۔

حضرت قمر مزید دلائل دیتے ہیں کہ راجہ صاحب بھی مردم شناس ہیں۔ وہ مقام اور مرتبے سے واقف ہیں، اسی لیے تو انھوں نے مجھے تقریب میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ عموماً امرا و رؤسا کے ہاں اعلیٰ عہدیداروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ جب کہ قمر کہتے ہیں کہ میں تو عہدہ کا مالک نہیں ہوں کہ مجھے تقریب میں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ زمینداروں کی بھی معاشرے میں خاص اہمیت اور مقام ہوتا ہے۔ ان کی اس حیثیت کے پیش نظر بھی محفلوں میں بلایا جاتا ہے۔ جب کہ قمر صاحب اس حیثیت کے مالک بھی نہیں ہیں۔ خاندانی جاگیرداروں اور ٹھیکے داروں کو بھی معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں بھی بطور خاص مدعو کیا جاتا ہے۔ قمر کہتے ہیں کہ میں جاگیردار اور ٹھیکہ دار بھی نہیں ہوں کہ راجہ صاحب مجھے محفل میں شرکت کی دعوت دیتے۔ میں تو ایک معمولی شاعر ہوں۔ شاعر کی قدر و قیمت اس کی ظاہری شان و شوکت اور لباس نہیں ہوتا بلکہ اس کی شاعری اور نظمیں ہوتی ہیں۔ فن کار کی قدر

وہ قیمت کا تعین تو اس کا فن کرتا ہے اور تخلیق خالق کا تعارف ہوتی ہے۔

اسی طرح شاعر کی تخلیقات اس کے مقام، حیثیت اور قدر و منزلت کا تعین کرتی ہیں۔ پُرعظمت شاعری شاعر کو عظیم بناتی ہے۔ لوگ کسی بھی شاعر کی اچھی شاعری کا مطالعہ کر کے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور شاعری کے مطابق ہی مقام دیتے ہیں۔ چناں چہ قمر کہتے ہیں کہ شہر میں میرا تعارف ایک شاعر کی حیثیت سے ہے۔ لوگ میری شاعری کی وجہ سے مجھے جانتے ہیں، میری قدر دانی اور عزت کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مجھے کسی کے سامنے شرمندہ اور پشیمان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ ایمرسن کا قول ہے کہ: ''خود اعتمادی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے''۔

عبارت نمبر 5:

(لاہور بورڈ 2007,10,11، گوجرانوالہ بورڈ 2006، بہاول پور 12ء)

''اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر و ناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے جاہ و رفعت علم و فضل کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں چوں کہ دل میں ضعف ہے۔ اہلِ دنیا کی حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامن گیر ہو جاتا ہے۔

سیاق و سباق:

زیرِ تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ قمر نے صبح کے وقت بغیر دودھ اور چینی کے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے پی اور قلم دوات سنبھال لی۔ ان کی بیوی نے اٹھ کر چائے کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ چائے پی چکے ہیں۔ لکھنے کا مرض انھیں جوانی سے تھا اور چالیس سال کی عمر میں وہ بڑھاپے کو پہنچ گئے تھے۔ ان کی تسکین کی صرف ایک چیز تھی کہ ان کی رفیقۂ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی آگے تھی۔ ایک رئیس کے یہاں سے دعوت نامہ ملا جسے پا کر وہ بڑے خوش ہوئے۔ سکینہ انھیں وہاں جانے سے منع کرتی ہے۔

زیرِ تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پرانی اچکن پہنے اور سر پر بے تکی سی ٹوپی رکھے راجہ صاحب کے ہاں جاتے ہیں۔ وہاں ان کی ایک انگریزی پوش سے جھڑپ ہو جاتی ہے۔ خاموش رہنے کی بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں اور کچھ سنائے بغیر واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن خوش ہیں کیوں کہ آج انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ چراغ ہیں اور جلنے کے لیے ہیں۔

تشریح:

زیرِ تشریح عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ حضرت قمر رئیس صاحب کی تقریب میں جانے کے لیے بضد ہیں۔ جب کہ اُس کی دور اندیش بیوی سکینہ اُسے جانے سے منع کرتی ہے کہ ان برے حالات میں جانا مناسب نہیں۔ راجا صاحب کے ہاں اعلیٰ منصب دار اور امرا آئے ہوئے ہوں گے جو کہ تصنع اور نمائش کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ حضرت قمر کو سکینہ کی اس دلیل میں جان نظر آئی تو قمر نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ رات کا اندھیرا ہونے کے بعد جاؤں۔ سکینہ اپنے شوہر کے فیصلے کی نفی کرتی ہے تو قمر ذرا خفگی کے عالم میں کہتے ہیں کہ میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ ہر شخص کے دل میں عزت، عہدہ اور مرتبہ حاصل کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ معاشرے میں اُس کی بڑی عزت ہو۔ لوگ اس کا احترام کریں وہ جہاں بھی جائے اُس کا استقبال کریں۔ اسی لیے انسان دنیا میں اعلیٰ منصب اور مال و دولت کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے کہ لوگ اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور معاشرے میں عزت ہو۔ امام غزالی کا فرمان ہے:

''دنیا یعنی مال و دولت اور جاہ و حشمت کی خواہش رکھنا سمندر کا پانی پینے کے مترادف ہے کہ جس قدر پیا جائے پیاس زیادہ لگتی ہے''

قمر صاحب نے جب محسوس کیا کہ اس کی فلسفیانہ باتیں سکینہ کی سمجھ سے بالاتر ہیں تو اُس نے کہا کہ اب تم یہ بھی پوچھو گی کہ ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک کیوں ہوتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے ہماری روح ترقی کی منازل طے کرتی ہے۔ عزت، شہرت، مال و دولت اور شان و شوکت سے روح کو تقویت پہنچتی ہے۔ اور روحانی طور پر اطمینان اور تسکین ملتی ہے۔ داخلی طور پر انسان مطمئن اور مسرور ہو جاتا ہے۔ حضرت قمر مزید کہتے ہیں کہ ہم انسان عظیم الشان کل یعنی اللہ تعالیٰ کا پاکیزہ اور لطیف سا حصہ ہیں۔ جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اور ساری کائنات میں موجود اور دیکھنے والا ہے ساری کائنات کو اللہ تعالیٰ نے بننے کا حکم دیا اور بن گئی۔ جب کہ انسان کو خود اللہ تعالیٰ نے مٹی اور پانی سے بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ جس کی وجہ سے ہماری روح اللہ تعالیٰ کی ذات کا ایک جزو ہے۔ اور جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے ہر شخص میں مرتبہ، عزت، شہرت، شان و شوکت اور علم و فضل کے حصول کی جانب فطری رُجحان اور میلان ہوتا ہے۔ جب یہ چیزیں فطرت میں شامل ہیں تو میں ان کی خواہش اور تمنا کو بُرا نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں بھی رئیس صاحب کی محفل میں ہر حال میں جاؤں گا۔ کیوں کہ مجھے توقع ہے کہ راجہ صاحب کے ہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے تعارف ہوگا۔ جس سے میری شہرت و عزت میں اضافہ ہوگا اور راجہ صاحب کے عطا کردہ انعام و اکرام سے میرے معاشی مسائل حل ہوں گے۔ ساتھ ہی حضرت قمر یہ خدشہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ دل دنیا کے اعتراضات اور حرف گیریوں سے ڈرتا ہے۔ ایک دانا کا قول ہے کہ: ''خوشی چاہتے ہو تو دنیا کا خیال چھوڑ دو''۔

اور بقول شاعر:

انسان ہی انسان کو بناتا ہے گداگر
فطرت کی عنایات میں افلاس نہیں

عبارت نمبر 6:

(بہاول پور بورڈ 2008)

اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے۔ اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست، شناسا یا رشتہ دار ہے، جس کا میں شرمندۂ احسان نہیں۔ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں کرتے۔

سیاق و سباق:

زیرِ تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ قمر نے صبح اٹھ کر چائے پی اور لکھنے بیٹھ گئے۔ لکھنے کا مرض انھیں جوانی سے تھا۔ جس سے ان کا جسم گھل گیا اور وہ چالیس سال کی عمر میں بڑھاپے کو پہنچ گئے۔ سکینہ انھیں ہوا کھانے کا مشورہ دیتی ہے۔ جس پر وہ عمل نہیں کرتے۔ ایک رئیس کے ہاں سے دعوت نامہ ملتا ہے۔ جس پر قمر بہت خوش ہیں۔ سکینہ وہاں جانے سے روکتی ہے جس پر وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں عزت و تکریم کی بھوک ہوتی ہے اور یہ بے کار نہیں ہے۔

زیرِ تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ پہلے وہ بازار میں سے دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکلتے تھے کہ کہیں قرض کا تقاضا نہ کر دیں۔ مگر آج وہ بڑی شان و شوکت سے سر اٹھا کر گزر رہے تھے۔ انھوں نے سب کو دعوت نامے کے متعلق بتایا اور سب بڑے مرعوب ہوئے۔ وہ راجہ صاحب کے ہاں پہنچے تو ان کی جھڑپ ایک انگریزی پوش سے ہو گئی۔ جس پر انھیں غصہ آیا اور بغیر کچھ سنائے گھر آ گئے۔ آج انھیں پتا چل گیا کہ ان کی جھونپڑی ہی ان کے لیے جنت ہے۔

تشریح:

زیرِ تشریح عبارت میں مصنف ... میں دن رات لکھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ میرا

فرض کام کرنا ہے، میں کام کرتا ہوں اور دل و جان سے کرتا ہوں۔ ساری دنیا آرام کی نیند سوتی ہے اور میں قلم لیے لکھنے میں مجبور ہوں۔ لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں، میرے لیے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں ہنسنے کی نوبت نہیں آتی۔ عید کے دن بھی میں نے چھٹی نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں تب بھی لکھتا ہوں۔ سو جو تم بیمار تھیں اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود اور آرام و سکون کو ترک کرنے کے بعد بھی، اگر دنیا میری قدر دانی نہیں کرتی نہ کرے۔ میں دنیا کے لیے لکھتا رہتا ہوں۔ میں اُن کے حق اور فائدے کی بات کرتا ہوں۔ میں آج کے مصروف اور مادہ پرستی کے دور میں بھی روحانیت کی باتیں کرتا ہوں۔ میں خلوص و محبت، امن و اتحاد کا پرچار کرتا ہوں۔ میں اپنی ذمہ داری نیک نیتی سے نبھا رہا ہوں۔ پھر بھی دنیا والے میرے قیمتی افکار و خیالات سے مستفید نہیں ہوتے تو اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں ہے۔

حضرت قمر اپنے آپ کو چراغ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں چراغ کی مانند ہوں، جس کا کام جلنا ہے۔ اندھیرا اور تاریکی مٹانا ہے۔ دوسروں کو روشنی فراہم کرنا اور کام آنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ چراغ روشن رہتا ہے اور دوسروں کے کام آنے کی ذمہ داری احسن طریقے سے انجام دیتا رہتا ہے۔ جو اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں جو اس کی روشنی سے محروم رہتے ہیں وہ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ کا فرمان مبارک ہے:

"جس طرح موم اپنے آپ کو جلا کر دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے اسی طرح تم بھی اپنے آپ کو جلاؤ"

اور بقول سید ضیاء الدین نعیم: ؎

راہ میں اک دیا ہی دھر جائے　　آدمی کچھ نہ کچھ تو کر جائے

حضرت قمر سکینہ کی اس بات پر کہ جن سے قرض مل سکتا تھا ان سے لے چکی اور جن سے لیا انھیں دینے کی نوبت نہیں آئی کے جواب میں کہتے ہیں کہ میرا ابھی ایسا کوئی دوست، واقف کار، رشتہ دار نہیں ہے، جس کا میں احسان مند نہیں ہوں۔ سب سے قرض لے چکا ہوں اور ابھی تک قرض کی ادائیگی سے قاصر رہا ہوں۔ جس کی وجہ سے اب گھر سے نکلتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کوئی قرض کا تقاضا نہ کر دے۔ محض اپنے ضمیر کی وجہ سے مطمئن ہوں کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کر سکیں مگر انھیں مجھ سے ہمدردی ہے، میری خوشی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

عبارت نمبر 7:

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پرانی اچکن، اور سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اُچکے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فربہی بجائے خود بارعب شے ہے مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

سیاق و سباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ قمر نے صبح اٹھ کر چائے پی اور لکھنے بیٹھ گئے۔ لکھنے کا مرض انھیں جوانی سے تھا۔ جس سے ان کا جسم گھل گیا اور وہ چالیس سال کی عمر میں بڑھاپے کو پہنچ گئے۔ سکینہ انھیں ہوا کھانے کا مشورہ دیتی ہے۔ جس پر وہ عمل نہیں کرتے۔ ایک رئیس کے ہاں سے دعوت نامہ ملتا ہے، جس پر قمر بہت خوش ہیں۔ جس پر وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں عزت و تکریم کی بھوک ہوتی ہے اور یہ بے کار نہیں ہے۔ بیوی وہاں جانے سے روکتی ہے۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ پہلے وہ بازار میں سے دکانداروں سے آنکھ بچا کر نکلتے تھے

کہ کہیں قرض کا تقاضا نہ کر دیں۔ مگر آج وہ بڑی شان و شوکت سے سر اٹھا کر گزر رہے تھے۔ انھوں نے سب کو دعوت نامے کے متعلق بتایا اور سب بڑے مرعوب ہوئے۔ وہ راجہ صاحب کے ہاں پہنچے تو ان کی جھڑپ ایک انگریزی پوش سے ہوگئی جس پر انھیں غصہ آیا اور بغیر کچھ سنائے گھر آگئے۔ آج انھیں پتا چل گیا کہ ان کی جھونپڑی ہی ان کے لیے جنت ہے۔

تشریح:

زیرِ تشریح عبارت میں مصنف نے حضرت قمر کی رئیس صاحب کی تقریب کے لیے روانگی کے وقت ان کے حلیے جذبات و احساسات کی لفظی تصویر پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ شام کے وقت حضرت قمر راجہ صاحب کی محفل کے لیے گھر سے نکلے، تو انھوں نے پھٹی پرانی اور بوسیدہ سی اچکن زیب تن کر رکھی تھی۔ اور پاؤں میں سڑے ہوئے اور پرانے جوتے پہنے ہوئے تھے اور سر پر بے ڈھنگی سی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس شکل و صورت سے وہ جاہل، اُجڈ، چور اُچکے اور اٹھائی گیرے معلوم ہوتے تھے۔ کیوں کہ انسان کی ظاہری شکل و صورت کا اپنا ایک تاثر ہوتا ہے۔ بلند قد و قامت اور اچھی شکل و صورت انسان کو پُر وقار بنا دیتی ہے۔ اور دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چناں چہ قمر صاحب بھی بلند قد و قامت اور اچھی شکل و صورت کے مالک ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان نظر آتی۔ اگر انسان کا جسم بھی کمزور و نحیف ہو اور جسم پر لباس بھی ڈھنگ کا نہ ہو تو دیکھنے والے متاثر نہیں ہوتے۔

کیوں کہ موجودہ زمانہ نمائش اور ریاکاری کا ہے۔ آج مصنوعی اور ظاہری چیزوں کی قدر و قیمت اور عظمت ہے۔ انسان سے زیادہ اس کے لباس کی اہمیت ہے۔ جس کا لباس قیمتی اور شان دار ہو لوگ اس سے فوری متاثر ہو جاتے ہیں اور اس کو ہر جگہ مقام دیا جاتا ہے۔ اس لیے آج کے دور کا انسان اپنی ذاتی خوبیوں پر توجہ دینے کی بجائے لباس پر توانائی صرف کر رہا ہے۔

شیخ سعدی کا فرمان ہے:

"صورت پرمت جاؤ بلکہ سیرت دیکھو"

مصنف مزید کہتے ہیں کہ حضرت قمر فربہ جسم کے مالک ہوتے تو دیکھنے والے رُعب میں آجاتے، کیوں کہ موٹاپا بذات خود ایک بارُعب چیز ہے۔ مگر ادبی خدمت اور موٹاپے میں خواہ مخواہ اور بلاوجہ کی دشمنی ہوتی ہے۔ کیوں کہ موٹاپا اور صحت مندی خوشحالی کی عطا کردہ ہے۔ جب کہ ادیب حضرات کے لیے غربت، افلاس اور ناموافق حالات کی وجہ سے دو وقت کا کھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ مادہ پرستی کا ہے۔ اس لیے روحانی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ قمر بھی روحانی قدروں کے پاسدار ہیں، جس کی وجہ سے زمانے کی ناقدری کا شکار ہیں۔

اگر کوئی ادیب موٹا تازہ اور صحت مند جسم کا مالک ہو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے اندر دُکھ درد، نرمی و نزاکت اور دردِ دل نہیں ہے۔ چناں چہ لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اس کی تخلیقات بھی ان خوبیوں سے عاری ہوں گی۔ قمر صاحب بھی ظاہری شکل و صورت اور شان و شوکت نہ ہونے کے باوجود بھی ایک اچھے انسان، دردِ دل رکھنے والے ادیب اور شاعر، شریف النفس اور مخلص انسان تھے۔ بہر کیف خارجی شان و شوکت اور ڈھنگ کا لباس نہ ہونے کے باوجود بھی، قمر صاحب راجہ صاحب کے دعوت نامہ کی وجہ سے احساسِ تفاخر سے سرشار تھے۔ اور ایک ایک عضو سے فخر و غرور کے ملے جلے تاثرات عیاں ہو رہے تھے۔ بڑے مطمئن اور خوش ہو کر راجہ صاحب کے بنگلے کی طرف رواں دواں تھے۔ خلیل جبران کا قول ہے:

"اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقین کر لو کہ زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا ہے۔"

عبارت نمبر 8:

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے مگر آج وہ گردن اٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دندان شکن جواب دینے کو تیار تھے مگر شام کا وقت تھا ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی ان کی

طرف نہیں دیکھتا۔ جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے، وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اُتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا۔ پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا۔

سیاق وسباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتا ہے کہ صبح کے وقت چائے پینے کے بعد قمر لکھنے میں مصروف ہو گئے، انھیں یہ مرض جوانی سے تھا اور چالیس سال کی عمر میں بڑھاپے نے انھیں آلیا۔ سکینہ ان کی بہت دل جوئی کرتی تھی۔ انھیں ایک رئیس کے یہاں سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے ان کی بیوی انھیں وہاں جانے سے روکتی ہے، لیکن ان کے بحث کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ شام کے وقت وہ پھٹی پرانی اچکن پہنے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے، پھر بھی ان کے ہر عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ قمر نے حافظ صمد بساطی کی دکان پر بڑی ڈینگیں ماریں۔ اس کے بعد کپڑے والے کی دکان پر گئے وہاں سے وہ راجا صاحب کے ہاں گئے۔ جہاں اُن کا بڑا پرتپاک استقبال ہوا۔ وہاں ان کی جھڑپ ایک انگریزی پوش سے ہوگئی، جس کی بحث کا جواب انھوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور بغیر کچھ سنائے واپس آ گئے لیکن انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کی جھونپڑی ہی ان کے لیے محل سے کم نہیں۔

تشریح:

زیر تشریح عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ حضرت قمر مسائل اور مشکلات کا شکار تھے۔ خستہ حالی اور معاشی مسائل کی چکی میں پسے ہوئے تھے۔ تحریروں کے عوض چند اخباروں سے تھوڑی سی رقم مل جاتی تھی جس کی وجہ سے دو وقت کی روٹی بھی ڈھنگ کی تیار نہیں ہوتی تھی۔ چناں چہ حضرت قمر کو گھر چلانے کے لیے اکثر قرض لینا پڑتا۔ ان کی آمدنی کا کوئی خاص بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے وقت مقررہ پر قرض ادا کرنے کی نوبت بھی نہ آتی۔ راجہ صاحب کا دعوت نامہ ملنے کی وجہ سے حضرت قمر میں بھرپور اعتماد اور رعب آ گیا تھا۔ اس سے قبل قمر گھر سے نکلتے ہی نہیں تھے۔ اگر کبھی بامر مجبوری گھر سے باہر جانا پڑ بھی جاتا تو قمر دکان داروں سے کترا کر نکل جاتے تھے، کہ کہیں قرض کی واپسی کا مطالبہ نہ کر دیں۔ اور سب کے سامنے عزت خاک میں نہ مل جائے لیکن آج قمر صاحب سب کے سامنے بڑے اعتماد سے گزر رہے تھے۔ برنارڈ شا کا قول ہے کہ:

"قرض وہ لعنت ہے جو اچھے اچھے لوگوں کو بھی ذلیل وخوار کر کے رکھ دیتی ہے"

راجہ صاحب کا کارڈ اُنھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ان کے ہاتھ میں دنیا جہاں کی دولت آ گئی ہو۔ آج وہ دکان داروں کے قرض کے مطالبوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر شام کے وقت دکانوں پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ اس لیے کوئی بھی دکان دار حضرت قمر کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ جس رقم کو حضرت قمر زیادہ سمجھتے تھے، وہ رقم دکان داروں کی نگاہ میں انتہائی معمولی تھی۔ بہر حال اتنی رقم نہیں تھی کہ سب کے سامنے اُس کی بے عزتی کر دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اس کے بعد دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر کھڑے ہو گئے۔ تا کہ وہ قرض کا مطالبہ کرے اور وہ رئیس صاحب کی نسبت ظاہر کر کے رُعب ڈالنا چاہتے تھے۔ حافظ صمد قمر صاحب کو دیکھ کر بولے کہ واہ صاحب آپ نے ابھی تک اپنے ذمہ قرض ادا نہیں کیا۔ آپ جیسے مزید گاہک آ جائیں تو دیوالیہ ہی نکل جائے۔ ہوشنگ کا قول ہے:

"تنگ دست قرض دار کا اعتبار اس کے دوست بھی نہیں کرتے"۔

عبارت نمبر 9:

(بہاول پور بورڈ 2007ء)

قمر اپنے اوپر جھنجھلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی

اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو طعن کی۔ "تمھارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ وکیل تمھارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے موکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمھاری طرف کیوں دیکھیں؟ انھیں بغیر فیس کے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لیے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ اس دنیا میں تمھارا اور کوئی مصرف نہیں۔"

سیاق و سباق:

زیر تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ صبح سویرے قمر صاحب نے بغیر چینی اور دودھ کی چائے پی اور لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ لکھنے کا مرض انھیں جوانی سے تھا۔ ان کی بیوی سکینہ ان کی بہت دلجوئی کرتی تھی۔ انھیں ایک رئیس کے یہاں سے دعوت نامہ ملا جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ شام کو سر پر بے تکی سی ٹوپی رکھے، پھٹی پرانی اچکن پہنے وہ راجا صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ جہاں ان کی جھڑپ ایک انگریزی پوش سے ہو گئی۔ جس پر انھوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

زیر تشریح اقتباس کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ وہ صاحب، جن کے اعزاز میں تقریب تھی، کی آمد پر لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ راجا صاحب نے ان سے ہاتھ ملا کر قمر کو نظم پڑھنے کے لیے کہا۔ لیکن انھوں نے کچھ بھی پڑھنے سے انکار کر دیا اور ناراض ہو کر واپس آ گئے، لیکن وہ بہت خوش تھے کیوں کہ انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کا جھونپڑا ہی ان کے لیے جنت ہے۔

تشریح:

زیر تشریح عبارت میں مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت قمر راجا صاحب کا دعوتی کارڈ پا کر پھولے نہیں سمائے تھے۔ بہت زیادہ خوش ہوئے تھے۔ قمر راجہ صاحب کی محفل میں اس توقع سے گئے تھے کہ وہاں اُس کا بڑے لوگوں سے تعارف ہو گا۔ اُس کی شہرت اور ناموری ہو گی۔ ساتھ ہی اُس کے معاشی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ یہ تمام خواہشات اور تمنائیں لے کر رئیس صاحب کی محفل میں پہنچے تو وہاں کا نقشہ قمر صاحب کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ محفل میں جس سے بھی تعارف کرایا جاتا، قمر صاحب کو ہتک آمیز جملے سننے کو ملتے۔ اور انھیں ان جملوں سے انتہائی صدمہ اور دُکھ ہوتا۔ ان کی وہ خوشی جو کارڈ ملنے سے حاصل ہوئی تھی محفل میں آ کر ساری معدوم ہو گئی تھی۔ دراصل انگریز جب برصغیر میں آئے تو وہ یہاں اپنی تہذیب، ماحول، ثقافت، رنگ ڈھنگ، شکل و صورت، لباس رہن سہن کا انداز، معاشرت، کھانے پینے کے آداب اور اپنی زبان ساتھ لے کر آئے اور برصغیر کی تمام مشرقی روایات، آداب، رہن سہن کا انداز، معاشرت، شکل و صورت، لباس اور تہذیب و تمدن کو پامال کر دیا۔ محبت و خلوص جیسی روحانی قدروں کی جگہ انھوں نے روپیہ پیسہ متعارف کرایا۔ روحانیت کی بجائے مقامی لوگوں کو مادہ پرست بنا دیا۔ جس کی وجہ سے روحانی اقدار بے توقیر ہو گئیں۔ چناں چہ شاعری کا تعلق بھی روح سے ہے اور خالص روحانی شے ہے۔ جب کہ راجہ صاحب کی تقریب میں آئے ہوئے سبھی لوگ مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کی نظر میں انگریز سرکار اور ان کی لائی ہوئی چیزوں کی قدر تھی۔

اس لیے حضرت قمر کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل بادشاہ وقت بھی شاعر کی شاگردی اختیار کر کے فخر محسوس کرتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے منظر نامہ تبدیل کر دیا اور شاعری جیسی روحانی چیز کو بھی بے توقیر کر دیا۔ جس کی وجہ سے حضرت قمر کو محفل میں اذیت اور ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے میں اُسے اپنا جھونپڑا جنت نما محسوس ہوا۔ جہاں اُسے سکون کی دولت میسر تھی۔ اُس کی بیوی اُس کی بات مانتی تھی۔ وہاں اُس کا مقام اور عزت تھی۔ سید علی ہجویریؒ کا فرمان ہے:

"جہاں تمھاری عزت کا لحاظ نہ ہوتا ہو، وہاں ہرگز نہ جاؤ"

حضرت قمر نے اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا کہ تمھارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ جو دوسروں کے بنگلوں اور محلوں میں خوشیاں اور عزت تلاش کرتے پھرتے ہوں، وہ اسی ذلت و رسوائی کے مستحق ہوتے ہیں۔ قمر صاحب اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بات کر رہے ہیں۔ اسے خود کلامی کا رویہ کہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اب تمھیں حقیقت کا پتا چلا ہے کہ تم کتنی عزت و توقیر کے حق دار ہو۔

آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں انتہائی خود غرضی کا دور ہے۔ رشتے، تعلق، دوستی سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی مطلب اور غرض چھپی ہوتی ہے۔ چناں چہ قمر خود سے ہم کلام ہو کر کہہ رہے ہیں کہ خود غرضی کے اس زمانے میں تم کسی کے کام نہیں آسکتے۔ رئیس صاحب کی تقریب میں آئے ہوئے وکیل تمھاری عزت کیوں کریں کیوں کہ تم اُن کی فیس ادا کر کے مؤکل بننے کے قابل نہیں ہو۔ اسی طرح ڈاکٹر اور حکیم تمھاری طرف کیوں متوجہ ہوں تم اُن کی فیس ادا کرنے کے لائق نہیں ہو اور وہ تمھارے گھر کیوں آئیں کہ تم اُن کی بھاری فیس ادا نہیں کر سکتے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ:

"امیر آدمی اپنی انا کی تسکین کے لیے غریب کا مذاق ہمیشہ سے اُڑاتا چلا آرہا ہے"

عبارت کے آخر میں قمر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمھیں قدرت نے لکھنے کے لیے بنایا ہے۔ تم اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے لکھتے جاؤ۔ اس دنیا میں تمھارا اور کوئی مقصد اور غرض نہیں ہے۔ آسکر وائلڈ کا قول ہے:

"خوشی دوسروں کے باغوں اور تفریح گاہوں میں نہیں بلکہ اپنے ہی گھروں میں رہتی ہے"

عبارت نمبر 10:

"اس لیے، کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لیے جنت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا، کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔"

سیاق و سباق:

زیرِ تشریح اقتباس سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ قمر نے صبح کی بنی چائے پی اور لکھنے بیٹھ گئے۔ بیوی سکینہ نے سیر کی تجویز دی، جس پر انھوں نے کہا کہ سیر کرنا تو وقت کا ضیاع ہے۔ سیر صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنھیں مہینے کے آخر پر تنخواہ مل جاتی ہے۔ مجھ جیسے مل مزدور سیر نہیں کرتے۔ انھیں ایک رئیس کے ہاں سے دعوت نامہ ملتا ہے جسے پا کر وہ بہت خوش ہیں ان کی بیوی پھٹے جانوں جانے سے منع کرتی ہے۔ جس پر قمر بضد ہیں، وہ سرِ شام پھٹی پرانی اچکن پہنے سر پر بے تکی ٹوپی رکھے بازار کے دو تین چکر لگاتے ہیں اور دکان داروں کو دعوت کے متعلق بتاتے ہیں، جس سے وہ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ رئیس کے ہاں ان کی تکرار ایک انگریزی پوش سے شاعری کے موضوع پر ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بغیر کچھ سنائے گھر واپس آجاتے ہیں۔

زیرِ تشریح اقتباس سبق کا آخری اقتباس ہے لہٰذا اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح:

زیرِ تشریح عبارت میں مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت قمر رئیس صاحب کا دعوتی کارڈ پا کر پھولے نہیں سمائے تھے اور بہت زیادہ خوش ہوئے تھے۔ قمر رئیس صاحب کی محفل میں جانے کی توقع سے لگے تھے کہ وہاں ان کا بڑے لوگوں سے تعارف ہوگا۔ ان کی شہرت اور ناموری ہوگی۔ ساتھ ہی ان کے معاشی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ یہ تمام خواہشات اور تمنائیں لے کر رئیس صاحب کی محفل میں پہنچے تو وہاں کا نقشہ حضرت قمر کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ محفل میں جس سے بھی تعارف کرایا جاتا تو قمر کو ہتک آمیز جملے سننے کو

ملتے اور انھیں ان جملوں سے انتہائی صدمہ اور دُکھ ہوتا۔ ان کی وہ خوشی جو کارڈ ملنے سے حاصل ہوئی تھی، محفل میں آ کر ساری معدوم ہوگئی تھی۔ کیوں کہ راجہ صاحب کی تقریب میں آئے ہوئے سبھی لوگ مغربی تہذیب اور ادب کے دل دادہ تھے۔ برصغیر کی چیزیں بشمول شعروادب ان کے نزدیک گھٹیا اور کمتر تھے۔ قمر کا تعلق بھی چوں کہ برصغیر سے تھا، اس لیے مغربی تہذیب کے دل دادہ لوگوں نے اسے بھی کمتر سمجھا تو حضرت قمر کو بھی توہین کا احساس ہوا اور غصہ بھی آیا۔

جب راجہ صاحب نے قمر سے فرمائش کی کہ وہ مہمان خصوصی جو کہ یورپ سے بڑی ڈگری لے کر آئے تھے، کی شان میں نظم سنائیں تو قمر نے انکار کر دیا، کہ میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی تو راجہ صاحب کا خبثِ باطن ظاہر ہو گیا اور کہنے لگے میں نے بے کار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا ہے۔ راجہ صاحب نے کسی دوسرے شاعر کا کلام سنانے کو کہا تو قمر نے کہا کہ معاف فرمائیے میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں۔ یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دیے۔ گھر پہنچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیوں آ گئے۔ چہرہ کھلا ہوا ہے، خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی۔ کہنے لگے ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی، سکینہ کہتی ہے کہ خوب خوش ہو رہے ہو۔ تو حضرت قمر کہتے ہیں، اس لیے کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے نصیحت اور سبق مل گیا ہے کہ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے بنا ہوں۔ جس کا کام اندھیرا اور تاریکی مٹانا ہے۔ دوسروں کو روشنی فراہم کرنا اور دوسروں کے کام آنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ چراغ روشن رہتا ہے اور دوسروں کے کام آنے کی ذمہ داری احسن طریقے سے سرانجام دیتا رہتا ہے۔

قمر کہتے ہیں کہ میں اپنی ذمہ داری اور منصب کو بھول گیا تھا۔ عزت اور شہرت کی خاطر راجہ صاحب کی محفل میں چلا گیا، گرونانک کا قول ہے کہ:

''اس عارضی زندگی کو جھوٹی خوشیوں کے جوئے میں نہ ہارو''

مگر خدا کا بڑا شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے زیادہ گمراہ نہ ہونے دیا۔ قمر صاحب کا ضمیر مطمئن ہے کہ اُس نے راجہ صاحب کی محفل میں اپنے فن کا سودا کر کے خلاف ضمیر کام نہیں کیا۔ قمر کہتے ہیں کہ میرا یہ جھونپڑا جہاں مجھے اطمینان وسکون کی دولت میسر ہے جنت کی طرح ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا ہے کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔ عبادت کا صلہ دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ملنا ہے اور اجر اللہ تعالیٰ خود عطا فرمائیں گے۔ عبادت کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے اور روحانی چیزوں کا متبادل مادی چیزیں نہیں ہوا کرتیں۔ اس لیے عبادات کے صلہ کی توقع بندوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔